

## اقبال کی زندگی کا ایک ورق

شیخ اعجاز احمد

اقبال کے کلام یا ان کے فلسفے کے متعلق میرا کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ آپ سے خطاب کرنے کے لئے میرا انتخاب غالباً اقبال سے اس قرابت کی وجہ سے ہوا ہے جس پر مجھے فخر ہے۔ اس قرابت کی وجہ سے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے متعلق بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں۔ جو میرے مشاہدے میں آئیں اور جن سے ان کے کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے آج ایک کا ذکر کروں گا۔ شاید آپ کی دلچسپی کا باعث ہو۔

چچا جان کو ملازمت سے ایک قسم کا تنفر سا تھا۔ ایم اے ہونے کے بعد کچھ عرصے تک وہ پہلے اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لکچرار اور اسکے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے اور انگریزی کے اسٹنٹ پروفیسر رہے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد انہوں نے لاہور میں بیرسٹری شروع کی لیکن اسکے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اعلیٰ پروفیسر بھی رہے۔ کالج کی ملازمت کی وجہ سے وہ صبح کے وقت کچھری نہ جا سکتے تھے گورنمنٹ نے خاص طور پر عائی کورٹ سے بہ انتظام کرایا تھا کہ ان کے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصہ میں پیش ہوا کریں چنانچہ قریباً ڈیڑھ سال تک اس پر عمل در آمد ہوتا رہا اس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا اور یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کیلئے مخصوص تھی۔ گورنمنٹ نے انہیں اس سروس کی پیشکش کی۔ لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بیرسٹری کے آزاد پیشے کو پسند کیا۔ چچا جان اوروں کو بھی جہاں تک ہو سکے ملازمت سے گریز کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں جب میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو میری آئندہ تعلیم کا مسئلہ گھر والوں کے سامنے آیا میری خواہش تھی کہ ایم اے میں داخل ہو جاؤں چچا جان کی رائے تھی کہ مجھے لا کالج میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے داخل ہونا چاہئے اس مسئلے کے متعلق کئی خطوط میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے لکھے اور آخر مجبور ہو کر میں نے لا کالج میں داخل

ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ستمبر کی چھٹیوں میں جب چچا جان چند دنوں کے لئے سیالکوٹ آئے تو میں نے اس معاملے کو پھر چھیڑا لیکن انہوں نے اپنی رائے تبدیل نہ کی۔ یہ بات مجھے ناگوار ہوئی۔ اور میں نے اس کے اظہار کا یہ طفلانہ طریق اختیار کیا کہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بھوک ہڑتال کر دی۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک تو گھر میں کسی کو اس بھوک ہڑتال کا شاید علم نہ ہوا۔ لیکن جب دوپہر کے کھانے کے لئے میں کمرے سے نہ نکلا تو والدہ صاحبہ نے کسی کو بلانے کے لئے بھیجا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ جو باوجود کھٹکھٹانے جانے کے نہ کھولا۔ پھر تو ایک تانتا بندہ گیا۔ والدہ صاحبہ اور دیگر رشتے دار مستورات یکے بعد دیگرے دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن اندر سے صداؤں نہ برخاست والا معاملہ رہا۔ آخر اس بات کی رپورٹ چچا جان کو پہونچی وہ نفسیات کے ماہر تھے انہوں نے مستورات سے کہا کہ میری بھوک ہڑتال کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ اس کے بعد رات ہو گئی مگر کسی نے ہماری خبر تک نہ لی۔ آتین قل ہواتھ پڑھنے لگیں۔ رات کے کھانے کے وقت جی چاہتا تھا۔ کہ کوئی بھولے سے بھی دروازہ کھٹکھٹائے تو کھول دیں لیکن کوئی دروازے کے قریب تک نہ آیا۔

جب سب لوگ سونے کے لئے چھت پر چلے گئے تو والدہ صاحبہ نے دروازے پر دستک دے کر کہا کہ کھانا دروازے کے باہر پڑا ہے بھوک لگے تو کھا لینا۔ یہ کہہ کر وہ بھی چھت پر تشریف لے گئیں۔ کچھ وقت کے بعد یہ اطمینان کر کے کہ سب لوگ اوپر جا چکے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا دروازے کے قریب ایک کشتی میں کھانا رکھا تھا۔ میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر دروازہ بند کر کے کمرے میں ہی سو گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا رات بے آراسی میں کٹی۔ صبح ناشتے کے وقت سے کچھ پہلے چچا جان دروازے پر آئے۔ دروازے کے اوپر والے حصے میں شیشے لگے ہوئے تھے جن میں سے میں نے انہیں دیکھ لیا اور فوراً اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس موسم میں گھر پر وہ اکثر دھوئی اور بنیان پہنے رہتے اس وقت بھی یہی لباس تھا لبوں پر خنیف سی مسکراہٹ تھی کمرے میں داخل ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تم گاندھی کے چیلے بن گئے ہو، میں نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں والدہ صاحبہ ان کے لئے ناشتہ لیکر آئیں۔ ہمارے بازار میں ایک حلوائی تھا اس کے ہاں کا حلوہ پوری بہت مشہور تھا۔ چچا جان بھی جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو

کبھی کبھی اس سے شوق فرماتے۔ والدہ صاحبہ خاص طور پر ان کے لئے اس کا  
 اہتمام فرماتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن بھی ان کے لئے ناشتے میں  
 چاء کے ساتھ وہی حلوہ پوری تھا۔ وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی  
 کرتے رہے۔ ایل۔ ایل۔ بی میں داخلے کے خلاف میرا اعتراض صرف یہ تھا  
 کہ وکالت میں کامیابی کے لئے میرے خیال میں تقریر کا ملکہ ضروری ہے۔ اور  
 چونکہ مجھے یہ ملکہ حاصل نہیں۔ لہذا میری طبیعت اس پیشے کی طرف راغب نہیں  
 ہوتی۔ انہوں نے فرمایا کہ بڑی بڑی تقریروں کی ضرورت صرف اعلیٰ درجہ کے  
 قانونی کام کے لئے ہوتی ہے۔ جو فی الحال پنجاب میں ہے ہی نہیں۔ اور وکالت کے  
 کام کے لئے طبعی لگاؤ کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر کہ محنت اور تجربے کی ہے۔  
 کہنے لگے کہ پریکٹس سے آدبی وکالت کے سب پہلو سیکھ جاتا ہے۔ اور اگر  
 ایل۔ ایل۔ بی کے بعد تم پریکٹس شروع کرو گے تو میں خود تمہیں کام سکھا دوں گا  
 آخر میں فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر تم ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کر لو  
 تو آئندہ زندگی میں بہت فائدے اٹھاؤ گے۔ اور اگر پریکٹس نہ بھی کرو تو  
 عملہ ملازمت ملنے میں سہولت ہوگی۔ میں نے پروفیسروں کی زندگی کے علمی ماحول  
 کا ذکر کیا تو فرمایا ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں  
 البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ اپنی گورنمنٹ کالج کی پروفیسری کا  
 ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق  
 پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی اپنے کلرک سے کرتا ہے۔  
 اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی بیزار ہوئی کہ ارادہ کر لیا  
 کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے پرہیز کروں گا۔ اگرچہ میری آئندہ تعلیم  
 کے متعلق وہ اپنی رائے پر پختگی سے قائم تھے لیکن آخری فیصلہ مجھی پر چھوڑا۔  
 میں نے ہتیار ڈال دئے اور لا کالج میں داخل ہونے پر رضامند ہو گیا۔ اس گفتگو  
 کے دوران میں وہ ناشتہ ختم کر چکے تھے۔ تولیہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے  
 کھڑے ہو گئے والدہ صاحبہ سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”پوریان  
 بہت لذیذ تھیں اعجاز کو بھی کھلائیے۔ کل سے فاقہ کر رہا ہے۔۔۔ رات کے کھانے  
 کے خالی برتن کمرے میں ایک طرف رکھے تھے۔ لیکن وہ ان کی طرف دیکھے بغیر  
 کمرے سے باہر چلے گئے۔ مجھے ایک عرصہ بعد معلوم ہوا کہ رات کا کھانا  
 انہیں کی ہدایت کے بموجب دروازہ پر رکھا گیا تھا۔ اور انہیں علم تھا کہ  
 سب کے چہت پر چلے جانے کے بعد میں نے چپکے سے اٹھ کر کھانا کھا لیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں میں نے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کر لی۔ پہلے چچا جان کا

خیال تھا کہ میں چکوال ضلع جہلم میں پریکٹس شروع کروں۔ اس ضلع کا کام اکثر ان کے پاس آتا تھا۔ اور وہاں کے مقدمے بازحقوق میں ان کی کافی شہرت تھی۔ لیکن اپنے بعض احباب سے مشورہ کر کے آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ میں چار پانچ سال اپنے شہر سیالکوٹ میں پریکٹس کروں۔ چنانچہ میں نے وہاں کام شروع کر دیا۔ وکالت کا پیشہ ایک صبر آزما پیشہ ہے۔ اور مبتدیوں کو ابتدائے کار میں بہت ہی ہمت شکن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے اس پیشے سے پہلے ہی سے بے رغبتی سی تھی۔ لہذا چند مہینوں کے بعد جب ایک دوست سے یہ معلوم ہوا کہ انکم ٹیکس کے محکمہ میں انکم ٹیکس آفیسر کی چند آسایاں خالی ہیں۔ تو میں نے درخواست دینے کا ارادہ کر لیا۔ چچا جان کو جب اس بارے میں تحریر کیا تو انہوں نے درخواست دینے کی اجازت دیتے ہوئے لکھا کہ ”وکالت کے پیشے کے متعلق جو تم نے لکھا ہے۔ وہ موجودہ صورت میں درست ہے۔ اور ابتدا میں واقعی بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ مگر آئندہ زمانہ میں اس پیشے کے لئے ترقی کے بہت سے امکانات ہیں بشرطیکہ گورنمنٹ نے مزید اصلاحات منظور کر لیں،۔ ان دنوں محکمہ انکم ٹیکس کے کمشنر مسٹر ڈارلنگ تھے۔ وہ چچا جان سے انگلستان کے زمانے سے واقف تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میں نے جب چچا جان کو اس کے متعلق لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ”ملازمت وغیرہ کے معاملے میں انگریزوں سے دوستی پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں مسلمانوں کو آج کل کسی قدر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اس شک میں ہمارے ہم وطن بھی انگریزوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گے،۔“

”مزید فرمایا کہ، اس وقت تو بالعموم انہی مسلمانوں کو ملازمت کے لئے پسند کیا جاتا ہے (خاص کر اعلیٰ ملازمتوں کے لئے) جن کی اسلامیت حکومت کے خیال میں کمزور ہو اور اس کمزوری کا نام وسعت خیال یا لبرلزم رکھا جاتا ہے،۔“

آخر مجھے انکم ٹیکس آفیسر مقرر کر کے چھ ماہ کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

انکم ٹیکس آفیسر صاحب، جن سے مجھے ٹریننگ لینا تھی، ایک ایسے ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو عیسائی ہو گیا تھا۔ ان کے تعصب کی کافی شہرت تھی۔ کچھ وہ سخت گیر تھے کچھ میں نا تجربہ کار اور رسم چاکری سے ناواقف اس پر طرہ یہ ہوا کہ رہائش کے لئے ویسا انتظام نہ ہو سکا جس کا میں عادی تھا۔ اس جسمانی اور ذہنی کورت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اختلاج کی معمولی سی شکایت ہو گئی۔ چچا جان کو خبر ملی تو وہ متردد ہوئے اور مجھے لکھا کہ ”اپنا مفصل حال لکھو۔ تو تمہارے لئے کوئی نسخہ تجویز کراؤں۔ یہ بھی فرمایا کہ

اس قسم کی شکایت مجھے بھی طالب علمی میں ہو گئی تھی۔ گھبرانا نہیں چاہئے۔  
اللہ تعالیٰ شفاء دیکھا،۔۔

میں نے جواب میں لکھا کہ صحت کے متعلق کوئی فکر کی بات نہیں البتہ  
انکم ٹیکس آفیسر کا رویہ ہمدردانہ نہیں۔ انہوں نے جواب میں جو خط لکھا  
اس کا اقتباس یہ ہے :

”تمہارا خط ملا الحمد للہ کہ کوئی خاص شکایت تم کو نہیں۔“

مجھے اس کا بڑا تردد ہو رہا تھا۔ کوئی فکر نہ کرنا اگر تم کام  
کر سکتے ہو تو کرو ورنہ کچھ پروا نہیں۔ آخر تمہارے ہاتھ میں ایک  
مفید پیشہ ہے۔ جس سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ رزق انسان کا عمرو زید  
کے ہاتھوں میں نہیں۔ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رزق از وے جو مجواز زید و عمرو  
مستی از وے جو مجواز بنگ و خمر

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہئے اور ہر قسم کی فکر دل  
سے نکال دینا چاہئے۔ خدائے تعالیٰ کا ساز ہے اور انسان کی فکر اس کے  
لئے باعث آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کاپیائی  
نہ ہوتی تو پھر کیا۔ خدائے تعالیٰ رزق کا کوئی اور سامان پیدا کر دینگے  
اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ غرض یہ ہے کہ انسان  
کو اپنی صحت و حالت کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی  
نہ کرنا چاہئے۔ اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں،۔۔

اس خط سے میرے دل کو بہت اطمینان ہوا میں نے تندی سے اپنے فرائض  
منصہی کو پورا کرنے کی کوشش جاری رکھی لیکن انکم ٹیکس آفیسر صاحب کا  
رویہ بدستور غیر ہمدردانہ رہا۔ میں نے پھر چچا جان کو خط لکھ کر مشورہ  
طلب کیا تو جواب میں ایک ہوسٹ کارڈ پر صرف یہ شعر لکھا ہوا موصول ہوا۔

”از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن  
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری،“

میرے لئے یہ شعر اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہو گیا۔ میں نے اسی دن ملازمت

سے استعفیٰ دے دیا اور سیالکوٹ واپس آگیا۔

ایک اچھی ملازمت کو میرے یوں ترک کر دینے کا ابا جان کو بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے چچا جان کو اس کے متعلق لکھا ہوگا کیونکہ میں نے ان کا جواب ابا جان کے نام دیکھا جس میں لکھا تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ انکے مشورے سے دیا گیا ہے وہ بد دل نہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔

میں نے سیالکوٹ واپس پہنچ جانے کی اطلاع دی تو مجھے بھی خط لکھا جس کا کچھ حصہ اب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس کا اقتباس سنٹیے۔

”تمہارا خط ملا۔ اسید ہے تمہاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی اور جو تکلیف تم کو ملازمت پر جانے آنے میں ہوئی ہے وہ بعد کی کامیابی سے نسبتاً منسیا ہو جائے گی۔ تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہئے۔ زندگی پر ان کا بھی (Restraining Influence) ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے ان کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور روح کو ایذا پہنچتی ہے۔ تاہم بعد میں فائدہ معلوم ہوتا ہے اور انسان اس بات کے لئے شکر گزار ہوتا ہے کہ اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے۔ جرمنی کے پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب اور بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔

Art still has truth — take refuge there.

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت میں جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے نام وہی ہے جو گوئٹے نے دیا صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے (Art) کی جگہ لفظ (Religion) رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔

آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں ہے مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔“

بہ خط ۱۰ جون ۱۹۲۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ آج تقریباً ۳۳ سال بعد اگرچہ اسلامی دنیا کی وہ حالت نہیں جو ۱۹۲۲ء میں تھی لیکن کون کم سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اس پیغام پر عمل پیرا ہونے کی اس سے زیادہ ضرورت نہیں جتنی ۱۹۲۲ء میں تھی۔

اپنی زندگی میں اقبال نے اس پیغام کو مختلف انداز میں بار بار اپنے کلام میں دہرایا ہے۔ آج ان کے انتقال کے بائیس سال بعد میں نے اس پیغام کو مسلمان نوجوانوں کے افادے کی خاطر اقبال کی اپنی اسی سیدھی سادی نثر میں دہرایا ہے جس میں انہوں نے یہ پیغام مجھے اس وقت دیا جب میں جوان تھا۔ اور مصافحہ زندگی میں شامل ہونے ہی پہلے قدم پر ایک ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔

چچاجان سے متعلق ان نجی واقعات کو آپ کے لئے بار سماعت نہ بناتا لیکن بقول اقبال :

برآور هر چه اندر سينه داری  
سرودے، نغمہ، آہ، فغانے